بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

طوفان خواہ کتنے ہی تباہ کن ہوں ان کی ابتدا چند ہلکے پھلکے جھونکوں سے ہوتی ہے اور چند تنکوں سے اُن کے رُخ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی حال کسی ملک میں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی طوفانوں کا ہوتا ہے۔ اُن کی ابتدا بھی چند چھوٹے چھوٹے واقعات بلکہ حادثات سے ہوتی ہے اور عوام کے ذہنوں میں اُن کی وجہ سے جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے اس سے اُن کے مزاج اور نوعیت کا بڑی آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے اس ملک کی سیاسی فضا میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ ایسے بگولے اُٹھ رہے ہیں بلکہ اٹھائے جا رہے ہیں جو کسی خوفناک طوفان کا پتہ دیتے ہیں۔ قتل و غارت کے اِکّا دُکّا واقعات بھی اگرچہ کسی مُہذب معاشرے کی اخلاقی صحت کی بربادی کی علامت ہوتے ہیں لیکن جب قتل و غارت معاشرتی زندگی کا معمول بن جائے بلکہ سیاسی وجوہ کی بنا پر شرفا قتل ہونے لگیں تو سمجھ لیجیے کہ ملک اب طوفان کی عین زد میں ہے۔

جماعتِ اسلامی کے معروف رہنما اور انتہائی بے لوث خادمِ خلق انسان جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا قتل کسی ایک فرد کا قتل نہیں بلکہ اخلاق و شرافت کا قتل، انسانی ہمدردی اور دلسوزی کا خون اور حق گوئی بیباکی پر کمینہ وار اور باطل کے مقابلے میں استقامت و عزیمت کی درخشندہ روایت پر شرمناک حملہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مقدس خون سے ظالموں نے اس لیے ہاتھ نہیں رنگے کہ اُن سے اُن کو کوئی ذاتی پرخاش تھی یا اللہ کے اس پاکباز بندے نے اُن کی جائداد پر یا دولت پر قبضہ کر رکھا تھا بلکہ یہ درندہ صفت انسان صرف اس لیے اس مردِ حق آگاہ کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے درپے تھے کہ وہ لوگوں کو یہ کہتا تھا کہ "جھوٹے خداؤں کی بندگی کو چھوڑ کر معبودِ حقیقی کی بندگی اختیار کرو"۔ اِس ایک

"جرم" کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا جرم نہ تھا اور اسی جرم کی پاداش میں اس ملک کے ہر آمر نے اس کی زبان بندی کے لیے کئی جتن کیے، مختلف طریقوں سے اُسے ستایا۔ اس کی نقل و حرکت پر پابندیاں عائد کیں۔ حتیٰ کہ اُسے ایک مرتبہ نہیں بلکہ متعدد مرتبہ قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا تاکہ وہ اپنے اس "جرم" سے باز آجائے، لیکن حق کے اس مسافر نے ان مصائب و شدائد کو پرِ کاہ کے برابر بھی نہ سمجھا اور حق و صداقت کی راہ پر بڑی پامردی سے گامزن رہا، یہاں تک کہ دشمن کے لیے اس ملک میں اس کا وجود ناقابلِ برداشت ہوگیا اور اس نے اس امر کا فیصلہ کر لیا کہ وہ حق پرست جسے نہ تو ظلم و استبداد ڈرا سکتا ہے نہ کسی دنیوی مفاد کا لالچ اسے خرید سکتا ہے، اُسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینے کی ایک ہی صورت ہے کہ اُسے گولی سے ٹھنڈا کر دیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور اسلام کا یہ بطلِ جلیل خدا کے دین کا علم بلند کرتا ہوا شہید کر دیا گیا۔ ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑی سعادت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر اپنی جان آفریں کے حوالے کر دے اور خدا وند تعالیٰ کے حضور میں اپنے خون کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے ادب و انکسار سے کہے ؎

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ڈاکٹر صاحب مرحوم دین و دنیا دونوں میں فائز المرام ہیں۔ وہ بڑے خوش نصیب ہیں کہ انہوں نے اپنا گوہرِ مقصود پا لیا ہے۔ البتہ جن لوگوں کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں اُن کے لیے یہ صدمہ جانکاہ ہے۔ اُن کی وفات سے اُن کے بیوی بچوں پر جو افتاد پڑی ہے وہ بڑی المناک ہے۔ اُن کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے دل جس طرح اُن کی جدائی سے زخمی ہوئے ہیں اُسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ زخموں کی اس ٹیس کو وہ خود ہی محسوس کرتے ہیں اور قحط الرجال کے اس دور میں جماعت اسلامی اپنے ایک بہترین کارکن کی خدمات سے جس طرح محروم ہوئی ہے اُس کا اندازہ اُن دردبھرے الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو امیرِ جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ان کی شہادت پر ارشاد فرمائے۔ یہ صدمات، نقصانات اور محرومیاں اپنی جگہ بڑی ہی تکلیف دہ ہیں اور ان کی تلافی کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی الا یہ کہ قادرِ مطلق غائب سے

کوئی سامان کر دے، لیکن ان سب سے بڑھ کر تکلیف دہ بلکہ تشویش ناک چیز جس کی طرف مولانا نے اشارہ کیا ہے وہ ملک کا انتہائی مخدوش مستقبل ہے۔ وہ کوتاہ بین لوگ جنہوں نے یہ سنگین جرم اس زعم باطل میں گرفتار ہو کر کیا ہے کہ اگر انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو خون کی رنگین چادر میں ایک مرتبہ ڈھانپ کر عوام کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے اس "خطرے" سے محفوظ ہو جائیں گے انہیں جلد ہی اپنی کوتاہ نظری کا احساس ہو جائے گا۔ ان سے پہلے بھی عقل کے اندھوں نے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اپنی نظر میں "ناپسندیدہ عناصر" کو خون کی چادر میں لپیٹ کر اپنی راہ سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن انہیں جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ اُن کا یہ ظالمانہ حربہ نتائج کے اعتبار سے سخت ناکام ہے اور اس نے اُن کے لیے نہایت سنگین مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ خونِ ناحق کے ہر قطرے سے لاتعداد "ناپسندیدہ عناصر" نے جنم لیا اور جن کے ہاتھ سے اپنے تخت و تاج کو محفوظ کرنے کے لیے اُن عاقبت نا اندیشوں نے خون کی ہولی کھیلی تھی وہی ہاتھ بالآخر ان کی بربادی کا سبب بنے۔

شرک کے بعد قتلِ ناحق سے زیادہ خدا کے نزدیک کوئی دوسرا جرم نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ (الفرقان-۶۸)	وہ لوگ جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے۔
مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ط (المائدہ-۳۲)	جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی

دنیا میں نوعِ انسانی کی زندگی کا بقا اس بات پر منحصر ہے کہ ہر انسان کے دل میں، دوسرے انسانوں کی جان و مال کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے کی زندگی کے بقا اور تحفظ میں مددگار بننے کا جذبہ صادق رکھتا ہو۔ جو شخص یا گروہ ناحق کسی کی جان لیتا ہے وہ انسانیت کے اس شیریں عنصر سے محروم

ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے انسانوں کی زندگی کا تحفظ چاہتا ہے۔ وہ صرف ایک فرد یا چند افراد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ اپنے عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیاتِ انسانی کے احترام سے اور ہمدردیِ نوع کے جذبے سے یکسر خالی ہے۔ لہٰذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے۔ ایسے دشمنِ انسانیت سے زیادہ رذیل شخص کون ہو سکتا ہے؟ اور اس کے خبثِ باطن سے یہ بات کس طرح بعید ہے کہ اگر اسے پوری نوعِ بشری کو قتل کرنے کا موقع میسر آئے تو وہ اس سے پرہیز کرے گا۔

محولہ بالا آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی موجود ہے کہ جب ایک مرتبہ کسی شخص یا گروہ کے منہ کو انسانی خون کی چاٹ لگ جاتی ہے تو پھر کسی انسان کی جان محفوظ نہیں رہتی۔ ایسا شخص یا گروہ ایک جان لینے کے بعد مطمئن نہیں ہوتا بلکہ دوسری جانوں کے درپے ہوتا ہے۔ یہاں تک پوری انسانیت کا لہو چاٹ لینے کے بعد وہ سیر نہیں ہونے پاتا بلکہ ہل من مزید کی دہائی دیتا ہوا اور انسانوں کی تلاش کرتا ہے تاکہ ان کے خون سے تسکین حاصل کرے۔

یوں تو ہر جرم کسی معاشرے کی اخلاقی بربادی کا موجب بنتا ہے اور جو شخص سب سے پہلے اس کا ارتکاب کرتا ہے اس کی گردن پر اُن مجرموں کے بوجھ کا بھی ایک حصہ لاد دیا جاتا ہے جو بعد میں اس کی شہ پا کر ظلم و تعدی کا یہ راستہ اختیار کرتے ہیں لیکن حدیث میں خاص طور پر قتل کے بارے میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ روئے زمین پر جو بھی قتلِ ناحق ہوتا ہے اُس کے وبال کا ایک حصہ قابیل کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے کہ اس جور و ستم کا بانی تو وہی تھا۔

حضور سرورِ دو عالمؐ نے اپنے مخصوص انداز میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا:

لا تُقتل نفسٌ ظلماً الا کان علی ابن آدم الاول کفلٌ من دمھا لانہ کان اول من سن القتل۔

جب ظلم (ناحق) سے کوئی خون ہوتا ہے تو آدمؑ کے پہلے بیٹے (قابیل) پر اس کے خون (ناحق) کا بوجھ پڑتا ہے کیونکہ اس نے سب سے پہلے قتل کی رہ نکالی۔

وہ ماہرینِ نفسیات جنہوں نے جرائم اور ان کے محرکات اور انسانی زندگی پر اُن کے اثرات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ اس بات پر قریب قریب متفق ہیں کہ کسی انسان کے لیے سب سے بڑا جرم اور اس بنا پر اُس کی طبیعت کے لیے سب سے مشکل کام قتلِ انسانی ہے۔ چنانچہ قاتل جب تک جوہرِ انسانیت

کو بکسر تیاگ کر ظالم درندہ نہیں بن جاتا وہ اس جرم کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ انسانی فطرت کا خمیر تعمیری رجحانات سے اٹھایا گیا ہے، تخریبی سے نہیں اس لیے وہ جب تک نفس کی ساری خباثتوں اور غلاظتوں سے اپنے دل کو ڈھانپ نہیں لیتا وہ اس وقت تک انسانی زندگی پر ہاتھ ڈالنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ اس جرم میں خوف کا عنصر بھی غیر معمولی طور پر شامل ہوتا ہے کیونکہ کسی دوسرے فرد کی جان پر حملہ درحقیقت اُس کی اپنی جان کے خلاف ایک خوفناک سازش ہوتی ہے مگر ایک مرتبہ وہ جب کسی انسان کے خون سے ہاتھ رنگ لیتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کے خوف میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے اور آخر کار انسانی جان کا زیاں اس کے نزدیک کھیل تماشے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

کسی فرد یا چند افراد کا عام حالات میں قتل اگر اتنے سنگین نتائج پیدا کر سکتا ہے تو اس قتل کی تباہ کاریوں کا اندازہ کیجیے جس کا ارتکاب سیاسی اختلافات کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ حکومت کے انتظام و انصرام کے طریقِ کار کو عرفِ عام میں سیاست کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں حتمیت اور قطعیت کی توقع نہیں کی جا سکتی جو عام طور پر سائنسی علوم یا مذہبی معتقدات میں پائی جاتی ہے۔ سیاسی امور میں اختلاف رائے کا ہونا اتنا ہی فطری ہے جتنا کہ کسی ذی روح میں سانس کی گردش۔ اس بنا پر دنیا کا ہر صحتمند معاشرہ سیاسی میدان میں اختلافات کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور اُسے اجتماعی ترقی کی سب سے نمایاں علامت سمجھتا ہے۔ البتہ وہ اس بات کا ضرور خیال رکھتا ہے کہ سیاسی اختلاف کی آڑ میں ملک و ملت کی تباہی کا سامان نہ کیا جائے۔ اس خطرے کے تدارک کے لیے ایک لگا بندھا طریق یہ وضع کیا گیا ہے کہ ہر معاشرہ پہلی منزل پر یہ طے کر لیتا ہے کہ اُسے کن اساسی تصورات کے علمبردار کی حیثیت سے دنیا میں زندہ رہنا ہے اور کن مقاصد کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہونا ہے۔ یہ اساسی تصورات اس معاشرے کی تشکیل میں بنیاد کا کام بھی دیتے ہیں اور اُس کی زندگی کے مختلف خانوں میں مخصوص رنگ بھر کر اُسے دوسرے معاشروں سے ممیز و ممتاز بھی کرتے ہیں، پھر ان امتیازات سے اُس کی نظریاتی سرحدیں تعمیر پاتی ہیں۔ مقاصد کا تعیّن اس کی جدوجہد کا رُخ متعین کرتا ہے جس سے اس کے اندر اخلاقی احساسات اُبھرتے ہیں۔ جو قومیں عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہنے کا عزم رکھتی ہیں وہ دوسرے

نقصانات تو برداشت کر لیتی ہیں مگر کبھی اس بات کو گوارا نہیں کرتیں کہ اُن کی زندگی کی اساس، ان کی نظریاتی سرحدوں اور اُن کے نصب العین کو کسی طرح گزند پہنچے۔ وہ ان کا پُوری قوت سے تحفظ کرتی ہیں اور جو لوگ ان کی طرف میلی نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔ خواہ وہ باہر کے دشمن ہوں یا گھر کے تخریب کار، وہ ان کا سختی سے محاسبہ کرتی ہیں۔ دنیائے مغرب میں ریاست اور حکومت کے مابین جو لطیف سا فرق پایا جاتا ہے وہ اجتماعی زندگی کی اساس اور نظریاتی سرحدوں کے بارے میں اہلِ مغرب کے غیر معمولی احساس کا نتیجہ ہے۔ ان دائروں میں ان کا احساس اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ انہوں نے ریاست کے اندر الوہیت کی شان پیدا کر دی ہے۔ ریاست کو ایک محسوس اجتماعی ڈھانچے سے اٹھا کر مجرد نظامِ فکر کی سطح پر لے جانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مغرب کے سیاستدان ریاست کو اپنی قومی زندگی کے اساسی تصورات کا ہیولا سمجھتے ہیں اور ان اساسی تصورات کے تقدس کی وجہ سے انہوں نے ریاست کے اندر شانِ کبریائی پیدا کی ہے۔ وہ اگر ریاست اور حکومت کے مابین یہ تفریق نہ کرتے اور اپنے اساسی نظریات کو اسی مقام پر رکھتے جس مقام پر کہ انہوں نے حکومت کو رکھا ہے تو اُن کا اجتماعی ڈھانچہ کبھی کا منتشر ہو چکا ہوتا۔

اسلام میں چونکہ خداوند تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی دوسری ذات صفتِ الوہیت سے متصف تصور نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے مسلمانوں کی پُوری تاریخ میں کبھی بھی ریاست کو اہلِ مغرب کی طرح کبریائی کے مقام پر فائز نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں سیاست کے بارے میں جو ادب ملتا ہے اس میں ریاست اور حکومت کے درمیان وہ واضح فرق محسوس نہیں ہوتا جو مغربی سیاست میں پایا جاتا ہے۔ ریاست اور حکومت کو ہم معنی سمجھنے کے باوجود اگر مسلمانوں کے نظمِ اجتماعی کو اُن کے دورِ عروج میں کوئی نقصان نہیں پہنچا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اساسی تصورات اور معتقدات سے کبھی اغماض نہیں برتا۔ ان کے سامنے یہ حقیقت برابر موجود رہی کہ ان کی بقا کا سارا دارومدار اُن تصورات اور معتقدات کے تحفظ اور اُن کے ساتھ غیر معمولی وابستگی پر ہے اس لیے انہوں نے ان پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دی اور اُن کی حفاظت اور پاسبانی کا فرض بڑی دلسوزی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ادا کیا جیسا کہ مغربی نیشنلزم کے پرستار آج کل کی الوہیت کی حامل ریاستوں کا کرتے ہیں۔

مگر حکومت کے بارے میں فاشسٹ ریاستوں کے علاوہ کسی نے بھی غیر مشروط اطاعت کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ ملکی نظام و انصرام میں اختلافِ رائے کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے اور اسے ہر عادل حکمران نے بڑی خوشدلی کے ساتھ برداشت کیا ہے بلکہ اگر اس نے کبھی یہ محسوس کیا کہ عوام اپنی رائے کو بے کم و کاست بیان کرنے میں تامل کر رہے ہیں تو اُسے اس کی فکر لاحق ہوتی اور جب تک اس رجحان میں نمایاں تبدیلی نہ ہوئی اس وقت تک وہ اصلاحِ حال میں بہم مصروف رہا۔ حکومت کا فرض اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ وہ شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کے علاوہ اُن تخیلات کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے جو اُس کے شہریوں نے اجتماعی زندگی کی اساس کے طور پر قبول کر رکھے ہیں۔ حکومت کا زیادہ تر تعلق عملی مسائل اور دشواریوں سے ہوتا ہے اور اس میں اختلاف رائے کا اُبھرنا بالکل طبعی امر ہے۔ اگر اساسی نظریات کے دائرے میں اختلاف کسی قوم کو انتشار میں مبتلا کرتا ہے تو اُمورِ مملکت میں اختلاف کو دبانے سے آمریت کی راہ ہموار ہوتی ہے

بد قسمتی سے پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں اجتماعی صورتِ حال سب سے مختلف اور سب سے نرالی ہے۔ حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں اجتماعی زندگی کی اساس کے تحفظ کا پورا پورا انتظام موجود تھا اور اس کے کسی گوشے میں معمولی سا نقصان بھی گوارا نہ کیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس جوش اور ولولے اور جس دینی حمیّت کے ساتھ مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا اس سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی اسلامی معاشرے کا دینی اساس کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق ہوتا ہے اور ایک مسلمان حکمران پر اس معاملے میں کس قدر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ لیکن جہاں تک اُمورِ مملکت کو چلانے کا تعلق ہے اس میں ہر قسم کے اختلافات بخوشی برداشت کیے جاتے تھے بلکہ خلفائے راشدین اسلامی مملکت کے شہریوں کو احتساب کے معاملے میں اُن کی ذمہ داریوں کا ہمیشہ احساس دلاتے اور جب کبھی وہ اُن کے اس احساس میں اضمحلال پاتے تو متفکر ہو جاتے۔

خلفائے راشدین کے بابرکت دور کے بعد جب ملوکیت کا دور شروع ہوا تو اگرچہ سیاسی حالات

(باقی صفحہ ۲۴ پر)